غم اور خوف سے نجات

قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ایک تجزیاتی مطالعہ

ـــــ ڈاکٹر احمد افضال ـــــ

(آخری قسط)

ساتواں سبق

قرآن حکیم کی بعض آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کام اللہ کے اذن کے بغیر نہیں ہو سکتا' اور بعض آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان اپنے ارادے اور عمل میں آزاد ہے۔ سطحی طور پر یہاں تضاد نظر آتا ہے جس کی وجہ سے متکلمین میں جبر و قدر کی طویل بحثوں نے جنم لیا۔ اس مسئلے کا تعلق اللہ تعالیٰ کے تکوینی رازوں سے ہے لہٰذا اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینا کسی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے۔ البتہ عملی نقطۂ نظر سے بعض باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

دنیا میں انسان پر وارد ہونے والے حالات کے پیچھے دو قسم کے اسباب کار فرما ہوتے ہیں' ایک تو عام مادی اسباب جن سے سب واقف ہیں اور دوسرے اللہ تعالیٰ کی مشیت جو پوشیدہ رہتی ہے۔ پھر انسان سے جو اعمال سرزد ہوتے ہیں ان کی پشت پر بھی دو قسم کے اسباب کام کرتے ہیں' ایک انسان کا اپنا ارادہ اور جد و جہد' اور دوسرے اللہ تعالیٰ کی مشیت۔

خدا نے کائنات کا نظام ایسا بنایا ہے کہ ظاہری طور پر اسباب اور نتائج آپس میں جڑے ہوئے ہیں اور ہر CAUSE سے کوئی نہ کوئی EFFECT برآمد ہوتا ہے۔ لیکن باطنی طور پر تمام اسباب سے نتیجے نکالنے والی ہستی اللہ کی ہے جو فاعل حقیقی اور مسبب الاسباب ہے۔ حیات دنیا کا ظاہری پہلو تو یہ ہے کہ حالات کی ہر تبدیلی کچھ وجوہات و اسباب سے ہوتی ہے

اور انسان کوئی مقصد حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ مناسب سعی و عمل نہ کرے۔ لیکن حیات دنیا کا باطنی پہلو یہ ہے کہ اللہ کے حکم کے بغیر نہ کوئی مصیبت آ سکتی ہے نہ نعمت مل سکتی ہے اور نہ اللہ کی مشیت کے بغیر ہمیں کوئی کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ہم ان ظاہری اور باطنی پہلوؤں' یا دوسرے الفاظ میں "تدبیر" اور "توکل" کے درمیان توازن برقرار رکھیں۔ تدبیر کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی مصیبت کو دور کرنے کے لئے تمام ممکن ذرائع و وسائل کو استعمال کرے' اور توکل کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا اصل بھروسہ اپنی قوت' ذہانت' صلاحیت' یا اسباب پر نہ ہو بلکہ صرف اللہ کی ذات پر ہو۔ تدبیر کا تقاضا یہ ہے کہ انسان رزق کی تلاش یا مقصد کے حصول میں پوری پوری سعی و جہد کرے' اور توکل کا تقاضا یہ ہے کہ جو کچھ پائے اسے اللہ کا عطیہ سمجھے' اپنی کوشش کا نتیجہ نہ جانے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم اپنی اونٹنی کو باندھو اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ (ترمذی)--- یہی بات ایک روسی کہاوت میں بیان کی گئی ہے کہ ساحل پر پہنچنے کے لئے خدا سے دعا کرتے رہو اور چپو چلانے سے ہاتھ مت روکو۔

لیکن بہت سے لوگ تدبیر اور توکل کے درمیان توازن سے محروم ہیں۔ جس کی نظر حیات دنیا کے ظاہری پہلو پر جم جاتی ہے وہ اپنی کوشش اور منصوبہ بندی کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے۔ اور جس کے دل میں حیات دنیا کے باطنی پہلو کا غلبہ ہو جاتا ہے وہ عمل سے بے نیاز ہو کر صرف توکل پر زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں معاملے کے صرف ایک پہلو کو اہمیت دینے کا نتیجہ ہیں۔ صرف اپنے زور بازو پر بھروسہ کرنے والا شخص یہ فراموش کر دیتا ہے کہ اللہ کے اذن کے بغیر ایک پتہ بھی جنبش نہیں کر سکتا۔ اور جو شخص اللہ کے بھروسے پر کوشش کو ترک کر دیتا ہے وہ دراصل اپنے رب کو آزمانے کی گستاخی کرتا ہے۔

ان دونوں میں سے پہلی قسم کے مغالطے نے زیادہ لوگوں کو متاثر کر رکھا ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم میں جابجا اللہ پر توکل اور اعتماد کرنے کی تلقین موجود ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے ساتھیوں کی یہ دعا نقل ہوئی ہے:

"اے ہمارے رب! تیرے ہی اوپر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف ہم نے

رجوع کرلیا اور تیرے ہی حضور میں ہمیں پلٹنا ہے"۔ (الممتحنہ: ۴)

حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے فرمایا تھا:

"میں اللہ کی مشیت سے تم کو نہیں بچا سکتا۔ حکم اس کے سوا کسی کا بھی نہیں چلتا۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور جس کسی کو بھی بھروسہ کرنا ہو اسی پر کرے"۔ (یوسف: ۶۷)

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جملہ نقل ہوا ہے:

"موسیٰ" نے اپنی قوم سے کہا کہ لوگو' اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اس پر بھروسہ کرو اگر مسلمان ہو"۔ (یونس: ۸۴)

اور حضور نبی کریم ﷺ کو بھی یہی ہدایت کی گئی کہ آپ اللہ پر بھروسہ رکھیں:

"اے نبی ان سے کہئے کہ میرے لئے اللہ کافی ہے' کوئی معبود نہیں مگر وہ' اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور وہ رب ہے عرش عظیم کا"۔ (التوبہ: ۱۲۹)

اچھی اور بری تقدیر: نادان لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ تقدیر کے عقیدے نے مسلمانوں کو بے عمل بنا دیا ہے۔ لیکن اصل میں قصور ہماری اپنی سوچ کا ہے' ورنہ ایمان بالقدر تو وہ چیز ہے جو انسان کو انتہا درجے کی بہادری عطا کر دیتی ہے۔ اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو کہ ساری دنیا مل کر بھی اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی سوائے اس کے جو اللہ نے مقدر کر دیا ہے' تو بڑے سے بڑا خطرہ اور خوف بھی اسے اللہ کی راہ سے نہیں ہٹا سکتا۔ اگر کسی کو یقین ہو کہ ساری دنیا مل کر بھی اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی سوائے اس کے جو اللہ نے مقدر کر دیا ہے تو اسے بڑی سے بڑی لالچ بھی حق سے متزلزل نہیں کر سکتی۔ تقدیر پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سوا کسی طاقت کو اپنے نفع و نقصان کا مالک یا فاعل و مؤثر نہ سمجھے' بے سروسامانی میں ہمت نہ ہارے اور نہ سروسامان پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرے' ناکامیوں پر مایوس نہ ہو اور نہ کامیابیوں پر غرور کرے۔ بلکہ تمام تر امید اور خوف صرف اللہ سے رکھے' اسی پر بھروسہ کرے' اپنے معاملات اسی کے حوالے کر دے اور اس کی رضا پر راضی رہنا سیکھ لے۔ تقدیر کا عقیدہ انسان کو بے عمل نہیں بلکہ اتنا دلیر بنا دیتا ہے کہ اسباب و وسائل کی کمی بھی اس کو جدوجہد ترک کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ ع

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی! یہی وجہ ہے کہ قرآن ہمیں جو تعلیم دیتا ہے' ایمان بالقدر اس کا اہم حصہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

"کہو کہ ہمیں کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لئے لکھ دی ہے۔ اللہ ہی ہمارا مولیٰ ہے اور اہل ایمان کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہئے"۔ (التوبہ: ۵۱)

"کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں یا تمہارے اپنے نفس پر نازل ہوتی ہو اور ہم نے اس کو پیدا کرنے سے پہلے کتاب میں لکھ نہ رکھا ہو۔ ایسا کرنا اللہ کے لئے بہت آسان ہے (یہ اس لئے بتادیا ہے) تاکہ جو نقصان بھی تمہیں ہو اس پر دل شکستہ نہ ہو اور جو کچھ اللہ تمہیں عطا فرمائے اس پر پھول نہ جاؤ"۔ (الحدید: ۲۳)

اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب نہیں آسکتی' اور وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو۔ پس جو مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے"۔ (آل عمران: ۱۶۰)

جو شخص یہ مانتا ہے کہ کائنات میں اصل حکم اللہ ہی کا چل رہا ہے' تو اسے عزم و ہمت کے ساتھ ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرنے کی طاقت حاصل ہو جاتی ہے۔ شدید ترین مصائب اور خطرات میں بھی اللہ کے فضل کی امید اس کو حوصلہ ہارنے سے بچاتی ہے' اور بڑے سے بڑے نقصان کے بعد بھی تسلیم و رضا کا جذبہ اسے مایوس نہیں ہونے دیتا۔

"کوئی مصیبت کبھی نہیں آتی مگر اللہ کے اذن ہی سے آتی ہے۔ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہو اللہ اس کے دل کو ہدایت بخشتا ہے"۔ (التغابن: ۱۱)

جو لوگ ایمان حقیقی سے محروم ہیں انہیں کوئی نقصان یا خسارہ پہنچ جائے تو عرصہ دراز تک کفِ افسوس ملتے رہتے ہیں اور اس ادھیڑبن میں مبتلا رہتے ہیں کہ اگر ہم یوں کرتے تو یہ نہ ہوتا یا اگر ہم فلاں تدبیر اختیار کرتے تو حالات کچھ اور ہوتے۔

"(کفار) کہتے ہیں کہ اگر ہمارے عزیز و اقارب ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور اور نہ قتل ہوتے"۔ (آل عمران: ۱۵۶)

"(منافقین) کہتے ہیں کہ اگر اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے"۔ (آل عمران: ۱۵۴)

قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ ایسی باتیں کرنا محض جہالت ہے۔ اس کے برعکس یقین رکھنا چاہئے کہ جو کچھ اللہ چاہتا تھا وہی ہونا تھا اور وہی ہوا۔ اور جو نہیں ہوا وہ ممکن ہی نہ تھا کیونکہ مشیت الٰہی کے خلاف تھا۔

"اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت واندوہ کا سبب بنا دیتا ہے۔"
(آل عمران:۱۵۶)

"ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے۔" (آل عمران:۱۵۴)

اسی طرح آنے والی آفتوں کے متعلق پریشان ہو کر جان ہلکان کر لینا بھی ایمان کے منافی ہے۔ اس لئے کہ کوئی نقصان اللہ کے حکم کے بغیر پہنچ ہی نہیں سکتا اور اگر اللہ ہی کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کوئی اسے روکنے والا نہیں۔

"ان سے کہو! کون ہے جو تمہیں اللہ سے بچا سکتا ہو اگر وہ تمہیں نقصان پہنچانا چاہے؟ اور کون اس کی رحمت کو روک سکتا ہے اگر وہ تم پر مہربانی کرنا چاہے؟"
(الاحزاب:۱۷)

اس سلسلے میں سب سے زیادہ روشنی دکھانے والی بات وہ ہے جو حضور نبی کریم ﷺ نے فرمائی۔ یعنی:

"ہر وہ چیز جو تمہیں نفع دے اس کی پوری خواہش کرو اور اللہ سے مدد مانگو اور خود اس راہ میں کوئی کمزوری نہ دکھاؤ۔ اور اگر تمہیں اس میں کچھ تکلیف پہنچ جائے تو یہ نہ کہو کہ اگر میں یوں کرتا تو یوں ہوتا' بلکہ یہ کہو کہ اللہ نے مقدر کر دیا تھا اور جو چاہا اس نے کیا۔ کیونکہ یہ 'اگر' شیطان کے عمل کا دروازہ کھولتا ہے۔" (صحیح مسلم)

اس سلسلے کی آخری بات یہ ہے کہ خواہ ہمیں اپنی کوشش کا پھل ملے یا اپنی غلطی کی وجہ سے نقصان اٹھانا پڑے' دونوں طرح کے نتائج نکلنے میں ہماری کوشش یا غلطی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی شامل ہوتی ہے۔ قرآن حکیم میں کم از کم دو مقامات پر خیر کی نسبت اللہ کی طرف اور شر کی نسبت بندوں کی طرف کی گئی ہے۔ تاہم دونوں مقامات پر یہ وضاحت بھی موجود ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے خیر و شر دونوں ہی اللہ کی طرف سے ہیں۔

"اور یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب (غزوۂ احد میں) تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے یہ کہاں سے آئی؟ حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں (فریق مخالف پر) پڑ چکی ہے۔ اے نبی! ان سے کہو' یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو نقصان تمہیں لڑائی کے دن پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا اور اس لئے تھا کہ اللہ دیکھ لے تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون۔"
(آل عمران: ۱۶۵۔۱۶۷)

"اگر انہیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے' اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو کہتے ہیں یہ تمہاری (یعنی رسول ﷺ کی) بدولت ہے۔ کہو سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ آخر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ تمہیں جو بھلائی بھی حاصل ہوتی ہے اللہ کی عنایت سے ہوتی ہے' اور جو مصیبت آتی ہے وہ تمہارے اپنے نفس کی طرف سے ہے۔"
(النساء: ۷۸' ۷۹)

اس نکتے کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر کا منبع ہے اور کائنات میں جس نوعیت کا بھی شر پایا جاتا ہے وہ دراصل انسان (یا جنات) کی طرف سے اپنے اختیار کے غلط استعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے خیر کی نسبت اللہ کی طرف اور شر کی نسبت انسان کی طرف کی جاتی ہے۔ لیکن ایک دوسرے زاویے سے دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں اختیار اللہ ہی کا دیا ہوا ہے اور انسان جب اپنے اختیار کا غلط استعمال کر کے برائیوں کو ظہور میں لاتا ہے تو یہ اللہ کے اذن اور مشیت کے ساتھ ہی تو ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے خیر و شر دونوں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ لہٰذا اوپر کی آیات میں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں رہتا۔

آٹھواں سبق

ایک مسلمان کو دنیا میں جو تکلیفیں اور مشکلیں پیش آتی ہیں' ان کے صلے میں اللہ تعالیٰ اس کی خطاؤں سے درگزر کرتا چلا جاتا ہے اور اس طرح دنیا کی تکلیف آخرت کا نفع بن جاتی ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

"مسلمان کو جو رنج اور دکھ اور فکر اور غم اور تکلیف اور پریشانی بھی پیش آتی ہے'

حتیٰ کہ ایک کانٹا بھی اگر اس کو چبھتا ہے تو اللہ اس کو اس کی کسی نہ کسی خطا کا کفارہ بنا دیتا ہے"۔ (بخاری و مسلم)

ہم میں سے کون ہے جو معصوم ہونے کا دعویٰ کر سکے؟ ظاہر ہے کہ ہم سب اللہ تعالیٰ کے عفو و درگزر کے محتاج ہیں' لہٰذا اس حدیث میں جو بشارت موجود ہے وہ دکھے ہوئے دلوں میں سکون و قرار پیدا کر سکتی ہے۔

نواں سبق

سکون قلب کے حصول کا ایک اور ذریعہ "دعا" ہے۔ ہم اپنے صوبے کے گورنر کے پاس اپنی درخواست اتنی آسانی سے نہیں پیش کر سکتے جس قدر سہولت کے ساتھ اس کائنات کے خالق اور پروردگار کے حضور التجائیں کر سکتے ہیں۔ ہم ہر وقت اور ہر جگہ' بغیر کسی پنڈت یا پادری کے' اللہ تعالیٰ سے مدد مانگ سکتے ہیں۔

"تمہارا رب کہتا ہے مجھے پکارو' میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا"۔ (المومن:۶۰)

"میں ان سے قریب ہی ہوں' پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں"۔ (البقرہ:۱۸۶)

حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ "قضا کو کوئی چیز نہیں ٹال سکتی مگر دعا" (ترمذی) اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ تو اپنے رب کے فیصلوں کو ٹالنے کی طاقت نہیں رکھتا' لیکن اللہ تعالیٰ چاہے تو کسی بندے کی التجا سن کر اپنا فیصلہ بدل سکتا ہے۔

اس معاملے میں ہم اکثر جلد بازی کرتے ہیں اور شکوے کرنے لگتے ہیں کہ دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہماری خواہش فوراً پوری نہ کرے تو اس تاخیر میں ہماری کوئی بھلائی اور اللہ کی کوئی مصلحت چھپی ہوتی ہے۔

ہم اپنے محدود علم کی وجہ سے ایسی شے بھی مانگ بیٹھتے ہیں جو خود ہمارے لئے بری ہوتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

"ممکن ہے کہ کوئی بات تمہیں بری لگے اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو۔ اور ممکن ہے کہ تم کسی امر کو مرغوب سمجھو اور وہ تمہارے لئے برا ہو۔ اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے"۔ (البقرہ:۲۱۶)

ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ ہماری آرزو کسی دوسری شکل میں پوری فرما دیتا ہے' اور ہماری مانگی ہوئی شے سے بہتر شے عطا کر دیتا ہے' یا اس کے بدلے میں کوئی مصیبت جو آنے والی تھی اسے ٹال دیتا ہے۔

پھر ہم کبھی اللہ تعالیٰ سے ایسی دعا بھی کر دیتے ہیں جس کا پورا کرنا اس کے حکیمانہ منصوبوں کے خلاف ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ دنیا میں تو اس خواہش کو پورا نہیں کرتا' لیکن ہماری دعا کو آخرت میں ہمارے لئے اجر و ثواب کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ دعا وہ شے نہیں جو ضائع ہو جائے۔ چنانچہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"ایک مسلمان جب بھی کوئی دعا مانگتا ہے' بشرطیکہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ ہو' تو اللہ تعالیٰ اسے تین صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں قبول فرماتا ہے۔ یا تو اس کی وہ دعا اسی دنیا میں قبول کر لی جاتی ہے' یا اسے آخرت میں اجر دینے کے لئے محفوظ کر لیا جاتا ہے یا اسی درجے کی کسی آفت کو اس پر آنے سے روک دیا جاتا ہے۔" (مسند احمدؒ)

دراصل جب ایک شخص اپنے مقصد کے لئے تدبیر اور کوشش کے ساتھ ساتھ اللہ سے دعا بھی کرتا ہے' تو گویا وہ شعوری طور پر اعتراف کرتا ہے کہ اگر اللہ نے چاہا تو یہ کام ہو گا ورنہ نہیں۔ اس طرز فکر کا فائدہ یہ ہے کہ اگر اسے ناکامی ہو جاتی ہے تو وہ اسے مشیتِ الٰہی جانے گا اور کسی غم و اندوہ' احساس محرومی' یا ناکامی کی اذیت کا شکار نہ ہو گا۔ یہ وہ روش ہے جسے "رضا بہ قضاء" کہتے ہیں۔ یا اگر اسے کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو اسے وہ اللہ کی مہربانی اور عنایت سمجھے گا اور کسی غرور میں مبتلا نہ ہو گا۔ اور یہ شکر گزاری کا طریقہ ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"آدمی کی خوش نصیبی یہ ہے کہ جو کچھ اللہ اس کے لئے فیصلہ کرے اس سے راضی ہو' اور آدمی کی بدبختی یہ ہے کہ اللہ سے خیر اور بھلائی کی دعا نہ کرے' اور آدمی کی بدنصیبی یہ ہے کہ اللہ کے فیصلے پر ناراض ہو"۔ (ترمذی)

دسواں سبق

قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ انسان دنیا میں مزے کرنے نہیں آیا ہے بلکہ اس کی پوری

زندگی خطرات' شدائد' اور مشقتوں سے عبارت ہے۔

"ہم نے انسان کو محنت و مشقت ہی میں پیدا کیا ہے"۔ (البلد:۴)

انسان کی پوشیدہ خوبیوں کا اظہار اور اس کے علمی و فکری ارتقاء کے لئے ضروری تھا کہ اسے سازگار اور پر سکون ماحول کے بجائے ایک ایسی دنیا میں رہنا پڑے جہاں تکلیف اور دکھ اور سختی اور مشقت سے واسطہ ہو۔

——————قرآن حکیم کے مطابق یہ مرتبہ صرف اہل جنت کو حاصل ہو گا کہ ان کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ افراد کو اس سے ملتی جلتی کیفیت دنیا میں بھی نصیب ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے بعض پسندیدہ بندے وہ ہیں جن کا اعتماد اور بھروسہ مخلوق پر نہیں بلکہ کلیۃً پروردگار پر ہو جاتا ہے۔ ان کا اللہ سے تعلق اس قدر مضبوط ہوتا ہے کہ نہ اس کے سوا وہ کسی سے ڈرتے ہیں اور نہ امید رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں دنیا ہی میں جنت کا مزا آنے لگتا ہے۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کا قول ہے کہ "میرے دشمن میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ میری جنت اور میرا باغ میرے سینے میں ہے' جہاں جاؤں گا وہ میرے ساتھ ہے[1]"۔ ارشاد الٰہی ہے:

"جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر قائم رہے' ان پر فرشتے اترتے ہیں کہ تم نہ اندیشہ کرو اور نہ رنج کرو اور خوشخبری سنو اس جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا"۔ (حٰمٓ السجدہ:۳۰)

جو لوگ مذہب کو چھوڑ کر دہریت یا ATHEISM کے قائل ہو جاتے ہیں ان میں بالعموم تکلیف دہ حد تک ذہنی کوفت اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے تصور سے دستبردار ہو جانے کے بعد نفسیاتی طور پر وہ خود کو تنہا اور بے سہارا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہ گویا ایک غیر فطری عقیدے کی نقد سزا ہے جو دنیا ہی میں مل جاتی ہے۔ اس کے برعکس طب کے پیشے سے متعلق افراد میں عام طور پر یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ زیادہ سکون اور قوت برداشت کا مظاہرہ وہی مریض کرتے ہیں جو زیادہ مذہبی ہوں۔ قطع نظر اس سے کہ

۱۔ تاریخ دعوت و عزیمت جلد ۲ صفحہ ۱۹۳

مریض کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے' اہم چیز یہ ہے کہ اگر وہ ایسی ہستی پر یقین رکھتا ہو جسے ہر شے کا علم ہے' ہر چیز پر قدرت ہے' اور جو انتہائی شفیق و مہربان ہے' تو ایسا مریض بہت کم حوصلہ ہارتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرین نفسیات اکثر اضمحلال اور ذہنی تناؤ کے مریضوں کے لئے دعا اور عبادت کا نسخہ تجویز کرتے ہیں۔ کسی مغربی مصنف کا جملہ ہے:

"IF YOU CAN'T STAND LIFE'S PROBLEMS,
TRY KNEELING".

اسی حقیقت کی شہادت دنیا کے عظیم ترین ماہرین نفسیات میں سے ایک (DR.CARL GUSTAV JUNG) نے بھی دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرے پینتیس برس سے زائد عمر کے مریضوں میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہیں جس کے مسئلے کا آخری حل زندگی کے مذہبی نقطۂ نظر میں نہ ملتا ہو۔[۲]

ہمارے لئے اللہ کے ذکر کا بڑا ذریعہ اس کی کتاب ہے۔ قرآن حکیم کی تلاوت اور اس پر غور و فکر کرنے سے انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت' قدرت' اور رحمت کا ایسا نقش قائم ہو جاتا ہے' جس سے مایوسی اور فکرمندی ختم اور اطمینان و سکون حاصل ہو سکتا ہے۔

"خبردار رہو اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔" (الرعد:۲۸)

حرفِ آخر

تاریخ گواہ ہے کہ اگرچہ انسان نے اپنی تدبیر اور کوشش کی بدولت بہت سی مصیبتوں اور آفتوں پر قابو پالیا ہے' تاہم تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ نئے مسائل اور نئی الجھنیں بھی جنم لیتی رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک دنیا کا موجودہ نظام قائم ہے' ہم مصائب و شدائد کو وارد ہونے سے کلیۃً نہیں روک سکتے۔ ایسی حالت میں خوف و حزن سے نجات کا

(باقی صفحہ ۴۹ پر)

۲۔ "MODERN MAN IN SEARCH OF A SOUL"